

(سفرنامہ)

عمر خیام کے دیس میں

<http://www.itsurdu.blogspot.com/ebooks>

باقی سیریا میں

عمر خیام کے دیس میں

(سفر نامہ)

بلقیس ریاض

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ چادریں اچھی طرح سے جسم پر ڈھانپ لیں تو وہ لوگ کچھ بھی نہیں کہیں گے۔“

میرے میاں دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ ہمارا خوف و ہراس ان کو پسند آ رہا تھا۔

آپ مسکرا رہے ہیں اور ہماری جان پر مبنی ہے۔“

میری اس بات پر وہ مسلسل مسکراتے ہوئے بولے۔

”چلو کسی سے تو ڈریں آپ لوگ۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ اس بات سے مسکرا رہے ہیں۔“

”بالکل اس بات سے۔“

ریاض نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

ناہید نے ریاض سے کہا۔

ریاض بھائی اگر سلیم میرے ساتھ ہوتے تو انہوں نے بھی یہی کہنی تھی چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔ آپ کے منہ یہ بات سن لی۔“

”میرا خیال ہے کہ میں ایران شفٹ ہو جاؤں۔ بیگم صاحبہ ہر وقت ڈرتی تو کہیں گی۔“

”ابھی ایران دیکھا ہی نہیں اور شفٹ ہونے کی سوچنے لگے۔ ہم تو پاکستان بھی نہ چھوڑیں۔“

”بلیقیں ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

ناہید نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

ریاض ایک بار پھر کھرکی سے نیچے بخر پہاڑوں کو دیکھنے لگے۔۔۔۔۔۔ ایئر ہوسٹس کمال پھرتی سے خاطر مدارت میں مصروف

تھی۔ چائے، جوس، فروٹ اور نہ جانے کیا کچھ کھلایا جاتا ہے۔ فرسٹ کلاس میں بیٹھے لوگوں کی مت مار دیتے ہیں اگر ان کا بس چلے تو

پیٹ کے ساتھ بھی کچھ باندھ دیں۔ مگر کچھ لوگوں میں کھانے کا حوصلہ بھی بہت ہوتا ہے۔ اگر کوک پیا ہے تو فوراً چائے مانگ لیں گے۔

یعنی سارا وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا ان کا مشغلہ ہے۔ عملہ بے چارہ بھی کیا کرے۔ کھلانے پر مجبور ہے۔

آہستہ آہستہ ساڑھے تین گھنٹے بھی گزر گئے۔ جہاز میں اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ وہ لینڈ کرنے والے ہیں۔۔۔۔۔۔ خواتین

نے اپنی چادریں ڈھونڈنی شروع کر دیں اور مرد حضرات بالوں میں کنگلیاں پھیر رہے تھے اور جن کو کنگھی مہیا نہیں تھی تو اپنی انگلیوں

سے بال درست کرنے لگے۔ جیسے ایرانی عورتیں انہیں کی منتظر تھیں۔

مشہد کے ایئر پورٹ پر مسافروں کے استقبال کے لیے پی آئی اے کا عملہ موجود تھا جس میں جنرل منیجر بمعہ اہلیہ کے سٹیشن منیجر اور پی آئی اے منیجر ظہیر صاحب اور ان کی اہلیہ صبیحہ اور کونسلٹ ارشد اور ان کی اہلیہ نذیر بیگم بھی موجود تھیں۔

جنرل منیجر کی اہلیہ زہرہ ممتاز نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک کمرے میں لے جاتے ہوئے ہماری تواضع چیری، سلپری اور کھپڑوں سے کی گئی۔

مسافروں کا استقبال کرنے کے لیے مسز ممتاز اپنے شوہر کے ہمراہ کچی سے آئی تھیں ناہید بار بار اپنی چادر درست کر رہی تھی تو میں مسز ممتاز سے گویا ہوئی۔

”سنا ہے کہ یہاں پر پردہ بہت سخت ہے۔“

”حجاب اسلامی کا خیال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو اجازت نہیں کہ کھلم کھلا بغیر پردے کے ہر ایک کے سامنے آئیں۔ صرف چہرہ ان کا نگاہ ہوتا ہے ورنہ سر سے پاؤں تک وہ پردے میں ہوتی ہیں۔

لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ یہ لوگ بڑی ہی محبت کرنے والی قوم ہیں۔ ہر شعبے میں عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے۔ صفائی اس قدر ہے کہ کہیں بند نظر نہیں آئے گا۔

مسز ممتاز نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور سر پر سcaf باندھا ہوا تھا شکل صورت سے وہ ایرانی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی صبیحہ اور نذیر بیگم اور پی آئی اے افسران کی بیگمات بیٹھی تھیں۔ مسز زہرہ ممتاز کو دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”آپ پاکستان دکھائی نہیں دیتیں۔“

”میں ایرانی ہوں۔۔۔۔۔۔ مگر ممتاز صاحب پاکستانی ہیں۔ دو بیٹے ہیں وہ سٹیٹ میں پڑھ رہے ہیں۔ ممتاز صاحب کا میں کافی ہاتھ بٹاتی ہوں۔“

ناہیدان کے قریب بیٹھے ہوئے بولی۔

”وہ تو لگ ہی رہا ہے“ مسز جمالی، مسز سعید فیض، مسز حاجی طالب، مسز نصرت علی شاہ ہماری ہمسفر بہنیں تھیں۔ ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں اور بڑی دلچسپی سے ان خواتین کی باتیں سن رہی تھیں۔ مرد حضرات دوسری سمت پی آئی اے کے عملے کے ساتھ بیٹھے تھے۔

کولڈ ڈرنک اور فروٹ کھایا جا رہا تھا۔

صبیحہ ظہیر نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ پہلی بار مشہد آئی ہیں۔“

”جی۔“

”آپ کو مشہد بہت اچھا لگے گا۔ مشہد تو پھر بڑا شہر مانا جاتا ہے اور یہاں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں بہت اچھے ہیں اور بہت سی سہولتیں ہیں بجلی پانی اور ٹیلی فون بوتھ ہر جگہ نظر آئیں گے۔ انسان آسانی سے فون کر سکتا ہے۔ ہر محلے میں گل فروش دکانیں ملے گی۔ ان لوگوں کی بیکری اور تنور بھی اپنا ہی ہوتا ہے۔ سارے محلے والے گھر میں روٹیاں نہیں بناتے۔ لمبی لمبی روٹیاں تلوں والی اورنگی روٹی جو خاص پتھروں پر بنتی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ بھی آسانی سے مل جاتی ہے نوکروں کا سٹم یہاں پر بھی ختم ہو گیا ہے۔ جن کی استطاعت ہوتی ہے وہ نوکر رکھ لیتے ہیں۔ آپ حیران رہ جائیں گی کہ یہاں پر بے روزگار لوگ بڑے ہی کم نظر آئیں گے۔ یہاں پر عورتیں اور مرد مل کر کام کرتے ہیں۔ مہنگائی یہاں پر بھی ہوئی ہے۔ بعض عورتیں قالین دھونے گھر گھر جاتی ہیں۔ محنت کو عیب نہیں سمجھا جاتا اور اگر بیوی پار لکھولنا ہو تو بیوی پار لکھولنے کے لیے حکومت سے اجازت لینی پڑتی ہے۔“

میں حیرانگی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ایران میں رہنے والی خواتین کے تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔

کونسلٹ کی اہلیہ نذیر بیگم نے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ”میں پچھلے محرم سے یہاں ہوں۔ زندگی بڑی ہی پرسکون گزر رہی ہے۔ بچوں کے لیے یہاں پر بے شمار سہولتیں ہیں۔ گورنمنٹ کے سکول ہیں۔ بڑی توجہ اور لگن سے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں گورنمنٹ کے سکولوں کا بہتر حال ہے۔۔۔۔۔۔ ہر علاقے میں پرائیویٹ سکول ملے گا۔۔۔۔۔۔ پیسہ بنانے کا بہترین طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔ ایران میں پرائیویٹ سکول کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر یہاں پر مہنگائی ہے تو سہولتیں بھی بے شمار ہیں۔ خالص چیزیں ملتی ہیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے ملک میں تو عورت تیس پچیس سال میں ہی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں پر ساٹھ سال کی عمر میں عورت جوان رہتی ہے۔ تمام خواتین بات چیت میں مصروف تھیں۔ ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست ہما ہوٹل میں کیا گیا جس کا نام پہلے (شیرین) تھا۔“

تمام مسافروں کا سامان ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ناہید اپنے کمرے میں جانے سے پہلے مجھ سے مخاطب تھی۔

”بلقیس ابھی کھانا کھانے کے بعد ہم حضرت موسیٰ الرضا کے روضے پر حاضری دینے کے لیے جا رہے ہیں۔ تم اگر چاہو تو میرے ساتھ چلی چلو میں نے الگ بندوبست کیا ہے۔“

”الگ کیوں کیا ہے۔“

itsurdu.blogspot.com

”آپ پاکستانی ہیں۔“

”جی میں تو پاکستانی ہوں مگر میری بیوی ایرانی ہے۔“

“احیاء”

میں نے تعجب سے دوبارہ ان کی جانب دیکھا اور کہا۔

”حالانکہ آپ ایرانی دکھائی دے رہے ہیں اور یہ محترمہ پاکستانی لگ رہی ہیں“

وہ اردو میں جواب دیتے ہوئے بولی۔

”میں ان کے ساتھ پاکستان رہ چکی ہوں۔۔۔۔۔ میرے میاں یہاں پر روزگار کے چکر میں آئے تھے اور مجھ سے شادی

کر بیٹھے۔۔۔۔۔ روزگار بھی مل گیا اور مجھے اچھا شو ہر بھی۔“

”تو آپ مطمئن ہیں۔“

میں بہت ہی مطمئن ہوں۔ بتا نہیں سکتا کہ میری بیوی کتنی وفادار ہے۔ سارا گھر کا کام کاج کرنے کے علاوہ میرا دفتر کام بھی کرتی

ہے اور جو سیاح پاکستان سے آتے ہیں ان کو سیر و تفریح بھی کراتی ہے۔“

”تم پاکستان میں خوش تھیں۔“

میں واقعی وہاں پر بہت خوش تھی۔۔۔۔۔ مگر ہمارے پاکستانی انصاف پسند نہیں ہیں۔ میں بہت بڑے کنبے میں رہتی تھی۔

دیورانیاں اور جھٹانیاں بھی تھیں۔ سب کی سب کام چور مجھے ایرانی عورت سمجھ کر یہ توقع کرتی تھیں کہ گھر کا سارا کام میں خود کروں۔

میں بتا نہیں سکتی کہ ایک مشین کی مانند میں اس گھر میں کام کرتی تھی مگر مجھ سے کوئی خوش نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ میں سب میں بہت خوشی

محسوس کرتی تھی۔ جب وہ ولگ زیادہ جنگ کرنے لگے تو میں واپس اپنے وطن آ گئی۔ میرے شوہر پاکستان رہنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ

یہاں سے اپنی نوکری سے درخواست ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں ساتھ چلنے کے لیے کہا تو انہوں نے جواب دیا۔

وہ نوکری سے جواب دے چکے ہیں اور مئے سرے سے نوکری ملنی بڑی مشکل ہے۔ بالآخر میں یہاں پر روزگار تلاش کر کے

تمہیں بلوالوں گا اور جب علیحدہ گھر لے لوں گا تو تم چلی آنا۔

میں دل برداشتہ ہو کر ایران آ گئی۔۔۔۔۔ میرے میاں نے بڑی کوشش کی کہ پاکستان میں کوئی ملازمت مل جائے مگر

کامیابی نہ ہو سکی۔

مگر ہماری حیرت میں تو تب اضافہ ہوا کہ جب چادروں سے بھری پلیٹیں ہمہ چلوں کبابوں کے ہمارے سامنے چن دی گئی۔
 ”ارے ان سب کو کون کھائے گا۔“

مسز ممتاز نے ہنس کر جواب دیا۔

”ایرانی تو بڑے شوق سے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ گوشت سے ان کو بہت ہی رغبت ہے۔“

”مگر اس طرح تو بہت سارا اناج ضائع ہو جاتا ہوگا۔“

بالکل ضائع نہیں جاتا۔ وہ ایرانیوں کے حساب سے کھانا پیش کر رہے ہیں۔“

چاولوں کی بھری پلیٹوں سے نظر نہی تو میری نگاہیں ان ویٹروں کی جانب اٹھ گئیں جو پھرتی کے ساتھ مہمانوں کے آگے چاول چلوں کباب پیش کر رہے تھے۔ ہٹے کٹے چھ پھنٹ کے ویٹر۔ شاید یہ کباب کھا کھا کر یہ لوگ اونچے لائے تھے۔ سرخ و سپید۔ ان کی عورتیں بھی اونچی لمبی سرخ اور سفید تھیں۔ موٹی تازی کھانے کی شوقین مگر ہمارے حلق سے وہ کھانا نہیں اتر رہا تھا۔ کتنا کوئی کھاتا ہم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”آپ نے کباب تو کھائے ہی نہیں“ ایرانی عورت نے حیرانگی سے پوچھا۔

”اتنے سارے کباب کھائے نہیں جاتے۔“

ہنس پڑی۔

مزے لے لے کر وہ چاول اور کباب کھا رہی تھیں۔ منٹوں میں ہی اپنی پلیٹ صاف کر چکی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد مہمان اپنے کمروں میں کچھ دیر کے لیے آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ کیونکہ ٹھیک چار بجے انہوں نے امام موسیٰ الرضا کے روضے پر حاضری دینی تھی۔

کمرے میں جانے کی بجائے ہم دونوں کافی شاپ کی جانب بڑھ گئے اس وقت بڑی سخت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ چائے کا آڈر دیا تو تھوڑی دیر ہی ویٹر نے میز پر ایرانی چائے رکھ دی۔ ریاض بڑے شوق سے پینے لگے۔

مجھے بڑی کڑوی سی لگی تو ویٹر سے دودھ والی چائے مانگی اس نے میرے چہرے کی جانب حیرانگی سے دیکھا فارسی تو مجھے آتی نہیں تھی ریاض بڑی اچھی فارسی بول لیتے ہیں انہوں نے فارسی میں پاکستانی چائے لانے کو کہا۔

وہ پھرتی سے دودھ دان اٹھا لیا اور میرے کپ میں دودھ ڈال دیا۔ میں نے گھونٹ بھرا تو نہایت ہی بد مزہ چائے تھی۔

”یہ تو فارسی بھی نہیں سمجھتے۔“

”اسی کو پی جاؤ۔“

”نہیں پی سکتی۔“

ویٹر کو دوبارہ بلا یا بڑی سمجھانے کی کوشش کی۔ انگریزی زبان اردو زبان فارسی نہ جانے کون کون سی زبان بولتے رہے مگر لاعلمی ظاہر کرتا رہا۔

ہوٹل کا منیجر قریب سے گزرا تو اس کو پاکستانی چائے کا کہا تو وہ ہماری بات سمجھ گیا۔

کچھ ہی منٹوں میں پاکستانی چائے ہمارے سامنے رکھی تھی۔ چائے کو دیکھ کر اپنا دیس یاد آ گیا۔ وہاں کی نعمتیں یاد آئیں۔ پھر خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ وہ جس حال میں بھی رکھے۔

چار بجے سے پہلے ہی ہم موسیٰ الرضا کے روضے پر حاضری دینے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ راستے میں سترے بارونق بازارفت پاتھ کے ساتھ ساتھ سفیدے کے درختوں کی قطاریں نظر آئیں۔ سڑکوں پر گہما گہمی تھی۔

شہر میں جو سب سے نمایاں چیز تھی وہ امام موسیٰ الرضا کا سنہری گنبد جس کی چمک دمک دھوپ کی وجہ سے اور بھی واضح ہو گئی تھی۔ شیعہ مسلمانوں کے نزدیک کربل کے بعد جس جگہ کا تقدس ہے وہ امام موسیٰ الرضا کا روضہ ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا۔

امام رضا کی ولادت 770 میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ مامون الرشید کی خواہش تھی کہ شیعہ اور سنی اپنی اپنی پچھلی رنجشیں بھول کر ایک ہو جائیں۔ انہوں نے امام رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کا عقد بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ بقول شیعہ تاریخ دانوں کے مامون الرشید نے امام رضا موسیٰ کو ایک دعوت دی۔ دسترخوان میں رکھے انگور کے دانوں میں زہر بھر دیا۔ امام رضا نے کھانے کے دوران انگور کو کھانے سے انکار کیا۔ مگر مامون الرشید نے بڑے پیار کے ساتھ وہ دانے ان کو پیش کئے۔ رضا اپنے دوست کے ہاتھوں سے وہ انگور کھا لیے انگور کھا کر وہ فوراً وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے جاتے ہوئے موسیٰ الرضا سے پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہو رضا۔“

جہاں آپ نے بھیجنے کی کوشش کی ہے۔“ اب نہ جانے یہ بات کہاں تک درست ہے تاریخ دانہ ہی جائیں۔

روضہ کے اندر داخل ہوتے ہی صدر دروازے کے دونوں طرف تبرکات کی دکانیں ہیں۔ چاندی کے تعویذ، تسبی، ٹوپیاں، کیلنڈر

اور خاص چیزیں خاک پاک۔

شاہ عباس کا تعمیر کردہ روضہ۔۔۔۔۔۔ اس کے بڑے سے دالان میں داخل ہوئے۔ جس کی تمام دیواریں اور چھت نیلے رنگ کی مینا کاری سے مزین تھیں۔

روضہ اس قدر بقہ نور تھا کہ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پیرس میں ورسائلز کے فانوس ابھی تک ذہن میں تاثر پیدا کئے ہوئے تھے۔ لیکن امام موسیٰ رضا کے روضے کی تمام چھت شیشے کی ہے اور اس پر لگے فانوس دیکھ کر حیرانگی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اتنی خوب صورتی اور کاریگری سے لگے تھے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ پھول بوٹوں کے نقش و نگار دیکھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

روضہ مبارک کے چاروں طرف نہایت خوبصورت چاندی کا جال چاروں طرف لگا ہوا تھا اور روضہ مبارک کے کمرے اور دالانوں میں نہایت دیدہ زیب ٹائلیں لگی ہوئی ہیں جو کہ ملتان کی ٹائلوں سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن نفاست میں ملتان سے اعلیٰ ہیں اور اس کے علاوہ کمرے اور دالانوں میں قیمتی قالین اور فانوس دیکھے تو فرانس کا عجائب گھر ورسائلز بھول گیا۔ یوں لگتا تھا کہ بنانے والے نے اپنا خون جگر صرف کر کے عقیدت کے پھول بکھیرے ہیں۔ روضے کا سنہری گنبد اور خالص سونے کے منقش دروازے دیکھ کر عقیدت مندوں کی عقیدت یاد آ گئی۔ اور یہ کہنا بھی حق بجانب ہو گا کہ۔۔۔۔۔۔ ہر دور کے حکمران نے حضرت امام علیہ السلام کے روضے کی زیبائش اور آرائش کے لیے کچھ نہ کچھ کیا ہے۔ آپ آٹھویں امام ہیں اور رسول کی اولاد میں سے ہیں۔ دن رات کوئی ایسا لمحہ نہیں جبکہ زاہرین کا امبوہ کثیر بلا تفریق کے منسلک۔ آنکھوں سے آنسو۔ لبوں پہ ان کا نام اور درود شریف پڑھتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ وہاں پر انسان کی عجیب ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ جو لکھنے سے قاصر ہوں۔

کالے جبوں میں عورتیں عبادت میں مشغول نظر آئیں، کوئی نفل پڑھنے میں مصروف اور کئی خواتین روضہ کی جالی پکڑے آہ و بکا کرتی ہوئی پائی گئیں۔۔۔۔۔۔ روضہ کے قریب جانے کو جی تو کر رہا تھا مگر عورتوں کا جھوم اس قدر تھا کہ آگے بڑھنے کی ہمت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

”آپ روضہ کی جالی کو ضرور ہاتھ لگا کر آئیں“ ہماری گائیڈ نے اصرار کرتے ہوئے ہمیں جھوم میں دھکیل دیا۔ پیچھے سے اس نے مضبوطی سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ جھوم کے ریلے کو چیرتے ہوئے میں جالی تک پہنچ گئی اور دوسرے ہی لمحے میں نے جالی کو پکڑ لیا۔ عورتوں کا سیلاب بڑھتا ہی چلا آیا۔ میں نے واپسی کا سوچا۔ مگر اس قدر رش تھا کہ ٹکنا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اس جھوم سے نکلی اور دور کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ ہماری گائیڈ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ میں ایران کی رہنے والی ہوں۔ مگر آج تک روضہ کی جالی کو ہاتھ لگانے کا شرف حاصل نہیں کر سکتی۔“

”واقعی۔“

”جی۔“

”تو تم نے ہاتھ لگا لینا تھا۔“

”اگر میں لگا لیتی تو آپ نہ لگا پاتیں۔“

”کیوں۔“

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں نے پیچھے سے مضبوطی کے ساتھ آپ کو تھاما ہوا تھا خیر ہم تو یہاں ہی رہتے ہیں کبھی نہ کبھی ہاتھ لگا ہی لیں گے مگر آپ کی مجھے بہت ہی خوشی ہے۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ناہید ہمیں ڈھونڈتی ہوئی دالان میں آگئی جہاں پر ہم جوتیاں لینے کی غرض سے کھڑی تھیں۔۔۔۔۔۔ ناہید کی آنکھوں میں عقیدت سے آنسو جاری تھے۔ اس پر عجیب قسم کی کیفیت طاری تھی۔ میں اس کی کیفیت کو بھانپ رہی تھی دعا کرنے کے بعد جوتیاں ہاتھ میں پکڑ کر ہم باہر کی جانب نکل پڑیں۔

”اب ہم بازار دیکھیں گے۔“

ناہید کی اس بات سے میں مسکرائی۔

”کرنسی تبدیل ہو چکی ہے۔ ناہید بازار نہ جائے یہ کیسے ممکن ہے۔“

”بلیقیں جی۔“

”ہونہہ۔“

میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے تمہیں شاپنگ سے غرض نہیں ہے۔“

”میں مسکرا پڑی۔“

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

[illegible]

میں غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”لیکن حجاب سے تو خدا بھی خوش ہوتا ہے۔“

”حجاب آنکھوں کا ہونا چاہیے۔ دلا کا اور صاف نیت خدا دیکھتا ہے۔ ہم لوگ جبراً پردہ کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔ اس سے خدا نے

کیا خوش ہونا ہے۔“

”آپ تو بغیر میک اپ کے بھی بڑی خوبصورت ہیں۔“

وہ میری بات سے مسکرا پڑی اور کہنے لگی۔

جانتی ہیں کہ یہاں پر کس قدر سختی ہے۔۔۔۔۔ اگر کوئی خاتون بازار میں بغیر پردے کے اور دیدہ زیب لباس میں نظر آئے

تو یہاں کی پولیس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو گرفتار کر لے۔“

“حج”

”بالکل سچی بات بتا رہی ہوں۔“

تھانے میں لڑکیوں کو لیجا کر۔۔۔۔۔ کیا حوالات میں بھی بند کر دیتے ہیں۔“

”بالکل۔۔۔۔۔ پھر باقاعدہ ضمانت دے کر ان کے لواحقین انہیں چھڑا کر لے جاتے ہیں۔

میں اس خاتون کی باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی۔ جتنی دیر اس نے مجھ سے باتیں کی تھیں اس کو میں نے پریشان ہی پایا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

”پاکستان بھی کبھی گئی ہیں۔“

”اب سوچ رہی ہوں کہ پاکستان ضرور جاؤں گی۔۔۔۔۔ مگر میرے شوہر کہتے ہیں۔ ہم پاکستان سے بہتر زندگی گزار رہے

ہیں۔ تمہیں ان سب کے بیچ میں گزارہ کرنا پڑے گا۔“

”کن سب کے۔“

ہیں۔“

”چلیں ایسا ہی کر لوں گی۔“

وی۔

ناہید نے مجھے کہا۔

”بلقیس آپ بھی کھا سکیں نا!“

”مجھے آئس کریم پسند نہیں ہے۔“

”کمال ہے یہاں کی سوشل آئس کریم سٹوری کے ساتھ پاکستان میں کہاں ملے گی۔“

”مل جائے گی۔۔۔۔۔۔ میں نے ویٹر کو تر بوز لانے کے لیے کہہ دیا۔

سب نے حیرانگی سے میری جانب دیکھا۔

”کمال ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارے ملک میں تربوزوں کی کمی ہے۔“

”ہمارے ملک میں آئس کریم کی بھی کمی نہیں ہے۔ کیا کچھ نہیں ملتا دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ یہاں پر سبھی کچھ ہے مگر ہمارے

ملک جیسی چائے نہیں ہے۔“

ایرانی خاتون نے مجھ سے کہا۔

”اگر پاکستانی چائے پینی ہے تو میرے گھر تشریف لائیں۔ میرے شوہر پاکستانی چائے ہی پیتے ہیں۔ اب تو مجھے بھی آپ کے ملک کی چائے پسند آنے لگی ہے۔“

میں آپ کے گھر ضرور آتی۔۔۔۔۔ مگر وقت اتنا کم ہے کہ ہم لوگ آ نہیں سکتے۔ زندگی رہی تو پھر آ جائیں گے۔“

”ضرور۔“

وہ خوش دلی سے جواب دیتے ہوئے ویٹر کو دیکھنے لگی جو تر بوز کے بڑے سے ٹکڑے کو میرے سامنے رکھ رہا تھا۔

”یہاں تربوز کا جواب نہیں۔۔۔۔۔ صرف تربوز ہی نہیں بلکہ یہاں کی ہر چیز بڑی ہی عمدہ ملے گی۔۔۔۔۔ ملاوٹ سے پاک۔“

”آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“

”خدا کا شکر تو ادا کرتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر کبھی کبھی فیشن کرنے کو بھی جی کرتا ہے۔“

”گھر میں کر لیا کریں۔“

میرا تو دل ہی مردہ ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔ عادت سی ہو گئی ہے۔ اس قدر خوف و دامن گیر ہے کہ گھر میں بھی جی کرتا ہے کہ یہ برقع ہی پہنے رہو۔“

اس وفد میں ایک نوجوان جوڑے کے ساتھ چند ماہ کی بچی بھی تھی ہر کوئی اس کو پیار کر رہا تھا۔۔۔۔۔ پیاری سی بچی ماں کی گود میں یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ بڑی ہی سمجھ دار ہو۔ نئے دور کی پیداوار ہر ایک کو نگر نگر دیکھتی۔ بات بات پر مسکراتی۔ ایرانی عورت سے باتیں کرتے ہوئے وہ بچی میری جانب دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ ویٹر ابھی تک مہمانوں کو آئس کریم پیش کر رہا تھا۔ اچانک جلدی میں آئس کریم لاتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑم سے فرش پر گر گیا۔۔۔۔۔ تو بچی نے یہ دیکھ کر کھل کھلا کر ہنسنے شروع کر دیا۔ ایرانی عورت نے حیرانگی سے بچی کو دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔

”بچی تو چند ماہ کی لگ رہی ہے۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ پاکستانی بچے بہت ہوشیار ہیں۔“

”مے دور کی ہجی ہے۔۔۔۔۔ آجکل کے سبھی بچے بہت ہوشیار ہیں۔“

کھانا کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ صبح نیشاپور جانے کے لیے پروگرام بن رہا تھا۔

صبح پتہ چلا کہ نیشاپور کا دورہ ملتوی کر دیا ہے۔ کیونکہ اسی روز مشہد میں پی آئی اے کے دفتر کی افتتاحی تقریب تھی لیکن میرے میاں نے اس پر احتجاج کیا اور مشہد کے گورنر سے گلہ کیا کہ ہمیں نیشاپور کیوں نہیں لیجا یا جاتا۔ اس پر اور اراکین نے بھی میرے میاں کا ساتھ دیا۔

گورز مشہد نے دو موٹروں بمہ پولیس کے حفاظتی دستے جو تیسری موٹر میں سوار تھے۔ ہمارے لیے ازراہ کمال مہربانی مختص کر دی۔ بالآخر ہم دو گاڑیوں میں سوار ہو کر عزم نیشاپور ہوئے۔

نیشاپور ایک تاریخی مقام ہے اور کسی زمانے میں علم و فن اور ایرانی، اسلامی تہذیب کا مرکز رہ چکا ہے۔ اس کا نام اتنے ہی عمر خیال جیسے شاعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ عمر خیام ماہر فلکیات کے طور سے جانا جاتا تھا۔ فٹر جبرلڈ نے عمر خیام کی فارسی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اسے دنیا سے روشناس کرایا اور اب عمر خیال ماہر فلکیات کم لیکن بطور شاعر زیادہ جانا جاتا ہے۔

ایک گاڑی میں مرد حضرات اور دوسری میں خواتین بیٹھی تھیں، میرے مقابل ناہید اور اس کے ساتھ حسن آرا بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔ عمر خیام کے بارے میں سنا اور پڑھا تو بہت تھا مگر یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کے مزار پر حاضری بھی دیں گے۔ چوڑی اور کشادہ سڑک پر ہماری گاڑیاں تیزی سے جارہی تھیں۔ ایرانی باشندے جتنے ست ہیں اتنے ہی گاڑی چلانے میں چست۔۔۔۔۔ باہر کے ملکوں کی طرح یہاں پر ٹریفک اتنی منظم نہیں تھی۔ ڈرائیور اپنی تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں آگ لگ گئی ہے اور اسے بجھانے کے لیے جا رہا ہے۔ گاڑی میں بیٹھے اتنے زور کا جھنکا لگتا کہ ہمارا سر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتا۔۔۔۔۔ ناہید نے ڈرائیور کے پاس بیٹھے ہوئے چودہ پندرہ سال کے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا ذرا فارسی میں تم ہی اسے کہو کہ گاڑی آہستہ چلائے۔“

وہ لڑکا ہماری جانب دیکھ کر مسکرایا۔۔۔۔۔۔ بے چارہ اکیلا ہماری گاڑی میں بیٹھا تھا۔ جب سے گاڑی چلی تھی وہ ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ لڑکے نے فارسی میں ڈرائیور کو سمجھایا۔ مگر اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”کہ ہم سب گاڑیوں سے پیچھے ہیں۔ اگر آہستہ چلائی تو ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔“

”اچھا اے کہو پھر احتیاط سے چلائے۔“

لڑکے نے اسے ایک بار پھر احتیاط سے چلانے کے لیے کہا تو وہ ہنس پڑا اور گاڑی اسی رفتار پر چلتی رہی۔

ناہید نے حسن آرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اس کو تو سمجھانا ہی فضول ہے۔“

“ناہیدہ“

میں نے باہر کے منظر کی طرف رجوع کرنے کو کہا۔

”باہر کا نظارہ بھی لو۔۔۔۔۔۔ خُطی کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”خاک نظاروں لوں سوائے بنجر پہاڑوں کے کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

[illegible]

کتنے بھلے لگتے ہیں۔“

”ارے واقعی ہی سبزہ بھی ہے اور گاؤں بھی“ اب ہماری گاڑی کے داعمیں اور بائیں جانب سبزہ ہی سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایک سو بیس کلو میٹر پر نیشاپور تھا۔۔۔۔۔ ہم تقریباً آدھا سفر طے کر چکے تھے۔

حسن آرا ناہید کے قریب ہی بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ وہ بھی نظارہ لینے میں محو تھی۔

”ہمارے ملک کی نسبت یہ گاؤں بہت ہی صاف ستھرے ہیں۔۔۔۔۔ تاہم قدیم ٹریٹنگ کے بارے میں برا بھلا کہہ رہی ہو۔

اپنے ملک سے ٹریفک یہاں کچھ منظم ہے۔“

”آبادی کے لحاظ سے منظم ہے۔۔۔۔۔ وہاں گاڑیاں زیادہ ہیں اور سڑکیں تنگ۔“

ناہید نے جواب دیا۔

میں نے ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”خدا کے واسطے ان مناظر کو آنکھوں میں سمولہ۔“

ناہید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ایک بندہ کافی ہے۔۔۔۔۔ منظر کو آنکھوں میں بند کرنے کے لیے۔“ ناہید کی اس بات سے میں مسکرا پڑی۔

بجھر پھاؤ، سبزہ اور چھوٹے چھوٹے گاؤں سے ہوتے ہوئے ہم نیشاپور کے باہر پولیس چوکی پر پہنچ گئے اور اس کے بعد ہماری

کاروں کو اندر جانے کی اجازت دی گئی۔

موثر ہیں ہمیں سیدھا ایک بڑے خوبصورت باغ کے باہر لے گئیں وہاں دور سے ہمیں ایک مینار دکھائی دیا اور ہمیں بتایا گیا کہ یہ عمر خیام کا مزار ہے۔ اصل میں مزار نہیں تھا بلکہ یادگار تھا اس کے پہلو ختم شدہ تھے اور اس کی مرمت جاری تھی۔

یادگار پر مخصوص ایرانی رنگ کا ٹائلوں کا کام ہوا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی سی گول قبر موجود تھی۔ طلبا اور زائرین اس باغ میں گھوم پھر رہے تھے۔ باغ میں نہایت ہی خوب صورت گلاب کے پھول کھلے تھے۔ موسم اتنا گرم نہیں تھا۔ فضا میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی تھی بلکی بلکی ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔۔ بھینی بھینی خوشبو سے دل معطر ہو رہا تھا۔

نیشاپور دیکھ کر خدا کی خدائی یاد آئی یہ بھی ثابت ہوا کہ ثبات صرف اللہ کی ذات میں ہے۔ چنار کے درخت جگہ جگہ دکھائی دیتے اس خطہ نے تاریخ اسلام کے عظیم فرزند پیدا کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شہر کو بغداد کی طرح ہلاک کرنے تہہ وبالا کیا۔

اس مزار سے باہر نکلے اور بائیں جانب جو دیکھا تو دو اور خوب صورت مزار دکھائی دیئے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک مزار حضرت ابراہیم زادہ رحمت اللہ علیہ کا ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ الرضا کے پاؤں مبارک کا نقش بھی موجود ہے۔ ابراہیم زادہ کے روضہ مبارک پر فاتحہ پڑھی۔

یہاں سے فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم لوگ ماحقہ مزار میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے بزرگ شیخ محروق رحمت اللہ علیہ کا ہے۔ ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ جل کر شہید ہوئے۔

ان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھی اور باہر نکلے تو پولیس گارڈ کے انچارج جس کو ہمارے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔ باغ کے باہر ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے اور چائے کی دعوت دے ڈالی جو ہم لوگوں نے بخوشی قبول کر لی۔

چائے کے ساتھ وہی کھیرے چیری اور خوبانی پیش کی گئی تمام لوگوں نے بڑی رغبت کے ساتھ کھائیں۔۔۔۔۔ ہم خواتین ایک میز پر بیٹھی تھیں۔ اپنے میزبان کے بارے میں بات چیت کر رہی تھیں۔

”یہاں کے لوگ خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔“

نصرت نے خوبانی کو اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

[illegible]

”اسی بات سے ان کی مہمان نوازی کا پتہ چلتا ہے“ میں نے ایرانی چائے پیتے ہوئے جواب دیا۔ گو کہ اس وقت پاکستانی چائے کی طلب ہو رہی تھی مگر ایرانی چائے کو اس وقت غنیمت جانتے ہوئے بی گئے۔

ہوئے کہا۔

”ہم خصوصی اجازت کے بغیر وہاں نہیں جاسکتے۔“ ناہید بے چاری دل برداشتہ ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور ہم واپس مشہد کے لیے روانہ ہو گئے۔

دوپہر کے کھانے کے وقت ہم مشہد پہنچ چکے تھے کھانے کا اہتمام دو جگہوں پر کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ تو ہوٹل میں ہی تناول کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ مگر میرے میاں بعند تھے کہ وہ حضرت امام رضا موویٰ کے لنگرخانہ میں کھانا کھائیں گے۔۔۔۔۔ کچھ اور لوگ بھی ہمارے ہمراہ لنگرخانہ میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

مسز ممتاز جو کہ خود ایرانی خاتون تھیں۔۔۔۔۔ چہرے پر مسکان سجائے ہمارے شانہ بشانہ نگر خانہ تک جانے لگیں۔ مسز ممتاز نے جو کہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون سر پر سکارف باندھے پاکستانی لباس میں ملبوس تھیں۔ مسز ممتاز کی آنکھوں میں محبت چمٹک رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ اتنی بااخلاق تھیں کہ خواہ مخواہ جی کرتا تھا کہ ان سے باتیں ہی کئے جاؤ۔

حضرت موسیٰ الرضا کے مزار تک جانے کے لیے وہ میرے ہمراہ گاڑی میں بیٹھیں۔۔۔۔۔۔ لنگرخانہ کی تصویر کشی بعد میں کروں گی۔ پہلے اپنی سوچ کا دائرہ بیان کر دوں تو مناسب ہوگا۔ اکثر درباروں کے لنگرخانوں کے قریب سے میرا گزر ہوا ہے۔ اس قدر رش ہوتا ہے کہ نیاز باٹنے والا لوگوں کے بچ دب سا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ نیاز لینے والوں کا جھوم ایک دوسرے کے اوپر گر رہا ہوتا ہے۔ کچھ یہی تاثرات لیے ہم موسیٰ الرضا کے روضے پر پہنچ گئے۔ وہاں سے نگران ہمیں لنگرخانے میں لے گئے۔ روضے کے بالکل دائیں جانب ہٹ کے چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔

وہ ہال اس قدر صاف ستھرا تھا کہ ہم دنگ رہ گئے ”کہ یہ لنگر خانہ ہے۔“

لنگر خانے کے ہال میں کافی میزیں لگی تھیں۔۔۔۔۔ کاؤنٹر کے شوکیسوں میں کھانا لگا تھا۔۔۔۔۔ ویٹر باقاعدہ وہاں سے کھانا نکالتے۔۔۔۔۔ اس کوڑالی میں لگاتے اور مہمانوں کے سامنے پیش کرتے۔۔۔۔۔ نہ صرف ہال صاف ستھرا تھا بلکہ وہ ویٹر سفید وردیوں میں پھرتی کے ساتھ کام میں مشغول نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔ جو مہمان کھانا کھا کر نکلتا تو اس میز کو باقاعدہ صاف کرتے اور دوسرے مہمانوں کے لیے پلیٹیں لگا دیتے۔

”کتنا عمدہ انتظام ہے۔۔۔۔۔۔ یوں لگتا ہے کہ کسی انگر خانہ میں نہیں بلکہ اچھے سے ریسٹورنٹ میں آ گئے ہیں۔“

مسز ممتاز نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

باہر کے ملکوں کے جو ریٹورنٹ ہیں وہاں پر اکثر سلیف سروس ملے گی۔۔۔۔۔ مگر یہاں پر پاکستانی ریٹورنٹ کی طرح سروس بھی ملے گی اور عمدہ کھانا بھی۔“

"مسز ممتاز۔۔۔۔۔ کتنے زائرین یہاں پر کھانا کھاتے ہیں۔"

یہاں پر تقریباً روز پانچ ہزار لوگ کھانا کھاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ جو بھی باہر سے آتا ہے وہ موسیٰ رضا کا مہمان بن کر آتا ہے۔“

”پانچ ہزار لوگ۔“

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”واقعی یا منج ہزار۔“

”لیکن یہ تو بڑے ہی منظم طریقے سے کھانا پیش کر رہے ہیں۔ ایک بار پھر مجھے اپنے ملک کے نگر خانے یاد آ گئے۔ تو مسز ممتاز نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میں بھی کراچی میں ہی رہتی ہوں۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں آپ کیا سوچ رہی ہیں۔۔۔۔۔ یہی کہ یہ نظام اتنا منظم کیوں ہے۔ یہاں کی گورنمنٹ بہت دلچسپی رکھتی ہے۔۔۔۔۔ تمام کے تمام نظام اسی طرح چل رہے ہیں۔“

میں مسز ممتاز کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی۔۔۔۔۔۔ ہمارے سامنے والی میز پر نصرت اپنی بھابی اور بھائی کے ساتھ بیٹھی تھیں ہونٹوں پر شرارتی مسکان تھی۔۔۔۔۔۔ کالے رنگ کی بڑی سی چادر اوڑھے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

[illegible]

نصرت مجھ سے ہمکلام تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

توجہ جناب ارشاد فرمائیں۔

”میں بھی کافی مرتبہ یہاں آچکی ہوں۔۔۔۔۔ جب بھی آؤ۔۔۔۔۔ یہ ننگر خانہ کھلا ہی ملے گا اور لوگ کھانا کھاتے ہوئے یا کہیں گے۔“

itsurdu.blogspot.com

“منت”

”کیوں۔“

”اچھا تو ایران میں بھی یہ وہا ہے۔“

”آپ نے پھر منت مانگی۔“

میں نے اس بچے کی جانب دیکھا۔

تین سال کا سرخ و سفید گول مٹول بچہ شرارتی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا اور ہماری باتوں سے اخذ کرنے کی کوشش کر رہا

تھا کہ وہ باتیں اسی کے متعلق ہو رہی ہیں۔“

”تو کیا آپ اکیلی ہی آتی ہیں۔“

”میرے شوہر ابھی تک کوئٹہ میں ہی ہیں۔ میرے والدین ایران میں ہیں اکیلی دودن کے لیے مشہد آتی ہوں۔ جی بھر کر حاضری دیتی ہوں اور دوسرے دن والدین سے مل کر ایران سے کوئٹہ واپس چلی جاتی ہوں۔“

”پھر تو مشہد سے آپ کا خاص رشتہ لگتا ہے۔“

وہ گویا ہوئی۔ واقعی میرا خاص رشتہ ہے۔۔۔۔۔۔ اور سب سے بڑی بات بتاتی چلوں کہ مشہد کا تاریخی رشتہ طوس سے جا ملتا ہے جس کی بنیاد جمشید نے ڈالی تھی۔ 819 عیسوی میں خلیفہ مامون الرشید نے شہناہ میں کچھ روز قیام کیا اپنے والد کے مزار پر حاضری دی۔ ان کے ساتھ ان کے داماد امام علی بن موسیٰ الرضا تھے۔ مامون نے زہریلے انگور حضرت امام علی الرضا کو دیئے جس سے ان کی شہادت واقع ہوئی۔ جہاں ان کا وصال ہوا وہ جگہ مشہد کہلاتی ہے۔

ایرانی عورت نے بھی وہی بات بتائی جو تاریخ دانوں نے بتائی تھی میں غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی کہ وہ پھر گویا ہوئی۔ جائے شہادت مشہد نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہاں پر زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اکثر عمارتیں اور حقیقی مزار سبکدین کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ محمود غزنوی نے نئی زیادت تعمیر کرائی 1007ء میں مشہد کو یوں تو مختلف فاتح وسطی ایشیا سے نقصان پہنچتا رہا مگر مشہد پھلا پھولا اور اس کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوا صدیوں کے دائرے میں۔

1975ء میں پرانی عمارتیں جو مزار کے ارد گرد تھیں گرا دی گئیں اور ایک سبز خطہ بھی مزار کے گرد بنوایا گیا۔ پہلوی دور میں انقلاب کے بعد یہ سبز خطہ عوام کے لیے کھول دیا گیا اور آپ کو بتاؤں کہ مزار بیش قیمت سونے چاندی شیشوں اور کاشی کے کام سے مزین ہے۔ ہر طرح سے یہ مزار اسلامی فن تعمیر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔“

اس کی بات کاٹتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

”آپ نہ بھی بتائیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ سونے چاندی اور شیشوں کے کام سے مزین ہے۔ میں پہلی مرتبہ جب داخل ہوئی تھی تو حیران ہی رہ گئی تھی۔ اس قدر خوبصورت کہ بڑی سبزی سیرگاہ بھی اس کے آگے کچھ نہیں۔“

وہ میری باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

”مشہد کی آبادی تین ملین کے قریب ہے اور یہاں ایران، پاکستان، افغانستان، انڈیا اور دوسرے ملکوں کے کونے کونے سے

زائرین جوق در جوق آتے رہے ہیں۔ قرآن پاک کے نادر نسخے اور خطاطی کے عظیم نمونے ایک میوزیم میں موجود ہیں جو مزار کے احاطے میں ہے۔ سمجھ لیجئے بنوایا گیا ہے۔ اس میں بہترین قالین اور مصوری کے نمونے پیش بہا قرآن کے نسخے جن پر عقیدت کے ساتھ فن کی عظمت جھلکتی ہے۔“

وہ بولتی جا رہی تھی اور میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی اس نے بتایا۔

خراسان کا صوبہ مشہد ہے۔ یہ ایران کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور اس کا نام آریائی لوگوں نے آج سے ہزاروں سال پہلے رکھا تھا۔ خراسان کا مطلب ”اجہرتے سورج کی زمین“ اس کا تعلق خراسان کی سیاسی اہمیت سے بھی ہے۔ اس صوبے میں دو بڑے صحرا بھی موجود ہیں۔ ”دشت لوط“ اور ”دشت کاویر“، عظیم پہاڑی سلسلوں ”البرز“ اور ”زگرس“ کے قدموں تلے۔۔۔۔۔۔ دریائے کاشف رود پانی کا بنیادی ذریعہ ہے اس خطے میں۔۔۔۔۔۔ مشہد کے آس پاس ’فردوسی‘ عمر خیام‘ امام محمد غزالی‘ شیخ فرید الدین بھی آرام فرما رہے ہیں۔ فیروزے کی کانیں بھی مشہد کے قریب ہی ہیں اور رضا بازار میں فیروزے اور نادر اشیاء بھی دستیاب ہیں۔“

میرے میاں خاموشی سے اس خاتون کی باتیں سن رہے تھے۔ اچانک بول پڑے۔

اتنی اچھی معلوماتی باتیں کرتے کرتے فیروزوں کی باتیں کرنے لگ گئی ہیں۔

وہ خاتون۔

کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اس کو ہنستے دیکھ کر تمام زائرین کی نظر اس پر پڑی اور وہ کچھ لمحوں کے لیے کھسیانی سی ہو گئی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم آج نیشاپور سے ہی واپس آ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ مشہد کے ارد گرد کی سیر کے علاوہ ہم نے کافی مزاروں پر حاضری بھی دی

ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن رضا بازار میں جو نادر اشیاء دستیاب ہیں اس کا ذکر سن کر دل ایک بار پھر سے لپچانے لگا ہے۔“

آپ سیر کے لیے آئی ہیں۔۔۔۔۔۔ لگتے ہاتھوں بازار بھی دیکھ لیں۔۔۔۔۔۔ پاس ہی تو ہے۔“

میں رضا بازار کل دیکھ چکی ہوں مگر جلدی میں کچھ نہ خرید سکی۔“

”چلیں آج خریداری کر لیں۔“

اس کی بات سے ریاض کے دوست جو کوئٹہ میں مقیم تھے اور اس وفد میں ہمارے ساتھ آئے تھے۔۔۔۔۔۔ اپنی خدمات

itsurdu.blogspot.com

میں دکھانے کے لیے راضی ہو جاتے۔

[illegible]

”کہ یہ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ ہم لوگوں کو یہ مسکین کہتے ہیں۔۔۔۔۔ غریب پاکستانی۔۔۔۔۔ ہماری یہاں پر کوئی پہچان نہیں ہے۔“

”کمال ہے مسلمان ہو کر یہ بات کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ پاکستانیوں سے نفرت کتنی بری بات ہے۔“

تمہارے لیے بری ہے نا! مگر ان کے لیے کوئی بری بات نہیں۔ صرف دوکان دار ہی نہیں ہر شعبے میں یہی حال ہے۔ جہاں چلے جاؤ پاکستانیوں سے نفرت کریں گے۔“

اس کی باتیں سن کر مجھے دلی رنج ہو رہا تھا مگر کیا کریں ہم رسول کے روضہ کے قریب کھڑے تھے۔ میں ان کو برا بھلا کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنا سامنہ لیکر واپس گھر آ گئی۔

”کس سوچ میں پڑ گئی ہیں۔“ میری ہمسفر بہن نے مجھے پکارا۔

“—”

”یہ والے فیروزے بہت اچھے ہیں۔ آپ بتائیں کہ میں کس ڈیزائن میں سیٹ بنواؤں۔“

”یہ تو آپ کی پسند پر منحصر ہے۔“

ہم اس وقت کوئی سات دوکانیں پھرنے کے بعد اس دوکان میں آئے تھے۔۔۔۔۔ ریاض کے دوست کو فیروزوں کی خاص پہچان تھی۔۔۔۔۔ بال آخر وہ اصرار کرنے لگے کہ آپ بھی چند فیروزے لے لیں گوکہ فیروزے لینا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ مقصد تھا تو صرف بازار میں گھومنے کا۔ ایران آ ہی گئے تھے تو سیر ہمارا اولین مقصد تھا۔

وہ فیروزے لے چکے تھے۔ ہم اس دوکان سے باہر نکلے تو ہماری نظر بہت سی دکانوں پر پڑی۔۔۔۔۔۔ میں حیرت میں تھی کہ یہاں بازاروں میں ہجوم کیوں نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارے ساتھ جو بھائی آئے تھے۔۔۔۔۔۔ وہ کافی مرتبہ ایران آچکے تھے۔۔۔۔۔۔ حضرت موسیٰ الرضا سے ان کو بھی خاصی عقیدت تھی۔۔۔۔۔۔ ان کی اہلیہ کا بس چلتا تو ہر ماہ یہاں چلی آتیں۔۔۔۔۔۔ کیونکہ ان کے شوہر سے زیادہ ان کی آنکھوں میں عقیدت چھلکتی نظر آتی تھی۔

”بھابی یہاں پر کام آرام آرام سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ بڑی پھرتی سے کام کرنے والی قوم نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ مگر پھر بھی چند سالوں میں ہی ان لوگوں نے بہت ترقی کر لی ہے۔۔۔۔۔۔ ان کو دیکھ کر ہمیں رشک آتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں اور ہم کون سے مقام پر کھڑے ہیں۔ شاید گھڑی کی سوئیاں ہمارے ملک میں رکی ہوئی ہیں۔ یہ بڑی بااخلاق اور ملسنا رقوم ہے۔“

وہ تو ان کے خلوص سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہم ایک دوکان میں داخل ہو چکے تھے۔ دوکان دارشادیدان کا واقف تھا اس نے ایرانی چائے کی پیش کش کی تو ہم نے اس کو خوبصورتی سے ٹال دیا۔۔۔۔۔۔ کہ ابھی پی کر آئے ہیں۔ اس میں جھوٹ بھی نہیں تھا جہاں کھانا کھایا تھا وہاں پر چائے بھی پی تھی۔ دوکاندار نے مختلف قسم کے فیروزے کاؤنٹر پر دکھانے شروع کر دیئے۔۔۔۔۔۔ ہم بڑی دلچسپی کے ساتھ فیروزوں اور دیتز پتھروں کو دیکھتے رہے۔۔۔۔۔۔ دوکاندار جو پتھر بھی دکھائے تو کہے یہ اصلی ہے اور وہ والے اصلی نہیں ہیں۔“

ہمارے ہم سفر بھائی فارسی بڑی اچھی بولتے تھے۔ میرے میاں بھی اچھی خاصی فارسی بول لیتے ہیں۔ ان کی بات چیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں سے بہت خوش ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئے۔

”دیکھا بھابی یہ لوگ کتنے ایماندار ہیں۔ غلط چیز کو اصلی بنا کر نہیں بیچتے۔“

”میں بھی اندازہ لگا رہی ہوں۔“

میں نے آنے والی بھاری بھر کم خاتون کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی برقعے میں لپٹی سر پر سکارف باندھے میرے لباس کی جانب غور سے دیکھ رہی تھی۔

دوکاندار نے جلدی سے ہمیں نبٹا کے اس کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ کالے موزے کالاجبہ اور کالابھی سکارف باندھے ہمیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ ہم باہر جانے کے لیے دوکان کا دروازہ کھولنے ہی والے تھے۔۔۔۔۔۔ کہ اس عورت نے مجھے مخاطب کیا۔

”آپ پاکستانی ہیں۔“

”جی“ میرے قدم وہیں پر رک گئے میں حیرانگی سے ایرانی عورت کی جانب دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ جو اردو بڑے شستہ لہجے میں بول رہی تھی۔

”آپ کیا۔“

”میں بھی پاکستانی ہوں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”واقعی پاکستانی ہیں۔“

”بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے یہاں پر آئے ہوئے پندرہ سال ہونے کو آئے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں پر رہتے رہتے ان جیسا ہونا پڑتا ہے۔“ دوکاندار حیرانگی سے ہماری بات چیت سن رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”آپ بھی فیروزے لینے کے لیے آئی ہیں۔“

”جی“ وہ کاؤنٹریریڈے فیروزوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی اور مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ لوگ کافی ایماندار ہیں۔ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔“

”مگر سب تھوڑی ایماندار ہوتے ہیں“ کیونکہ مجھے ہوٹل میں کسی نے بتایا تھا کہ ایرانی بھی دھوکے باز ہوتے ہیں۔“

”وہ تو ہر ملک میں لوگ ایماندار بھی ملیں گے اور بے ایمان بھی۔۔۔۔۔ مگر اکثریت یہاں کی ایماندار ہے۔“

”یہ سنتے ہی ریاض کے دوست کی بیوی نے وہاں سے کافی شاپنگ کر لی۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”پاکستان یا نہیں آتا۔“

”پاکستان کو ہر لمحے ہم بہت یاد کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے کہ یہاں پر روزگار ہے اور کھانا پینا اور سر چھپانے کو اللہ کے

فضل سے جگہ بھی ہے مگر کوئی ساعت ایسی نہیں جو اپنے ملک کو یاد نہ کریں۔“

”تو آپ واپس اپنے ملک چلی کیوں نہیں جاتیں۔“

”جانے کو تو آج چلے جائیں مگر پاکستان کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ ہماری بیٹیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ ان کی شادیاں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

“کل۔“

میں نے قریب بیٹھے ہوئے میاں کو سوال یہ نگاہوں سے دیکھا۔۔۔۔۔ انہوں نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے۔۔۔۔۔۔ کہ ہم رضا شاہ پہلوی کا محل دیکھنے کے لیے جائیں گے۔“

ایک اور بہن نے ریاض سے پوچھا جو شیشے کا سامان لینا چاہتی تھیں۔

”ریاض بھائی۔۔۔۔۔تو بازار کب جائیں گے۔“

“بازار”

ریاض نے فوراً جواب دیا۔

”محل دیکھ کر جب واپس آئیں گے تو بازار بھی چلے جائیں گے۔“

”اگر میرا مشورہ مانے تو کہوں۔“

”ضرور کہیں۔“

”یہاں کی حکومت بہت سخت ہے آپ شیشے کا سامان لینا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ لوگ کھلا سامان حوالے کریں گے۔ آپ

کہاں سے پکینگ کرواتی پھریں گی۔“

”آپ کو کس نے کہا۔۔۔۔۔۔ کہ پیکنگ کر کے نہیں دیتے۔“

”بھائی بالفرض اگر پکینگ کر بھی دیں تو۔۔۔۔۔ جانے سے پہلے وہ سارا سامان کھول کر چینگ کرتے ہیں۔۔۔۔۔“

چیزیں ان پیک تو ہو ہی جائیں گی۔“

ناہید نے افسردگی سے کہا۔

مگر میں نے تو لیمپ خریدنے سے تھے اور دیگر اشیا بھی لینی تھیں۔

”آپ ٹوٹنے والی چیز نہ خریدیں۔“

”اتنی دور آئی ہوں۔۔۔۔۔ خریداری کر کے نہ جاؤں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں تو بلقیس کو بھی کہہ رہی ہوں کہ گھر کے

”لے کر کچھ خریدے۔“

”لو میں آپ کو منع کر رہا ہوں اور آپ اسے بھی۔۔۔۔۔ خریداری پر اکسا رہی ہیں۔ میمونہ قریب سے گزرتے ہوئے گویا

میں نے میمونہ کو جواب دیا۔

”یہ بے چارے بہت بھولے اور جلیبی کی طرح سیدھے ہیں۔“

”بھئی مسئلہ کیا درپیش ہے۔“

”میمونہ بہن یہ دونوں خواتین شاپنگ کرنا چاہتی ہیں مگر میں ان کے فائدے کے لیے روک رہا ہوں کہ راستے میں چیزیں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔“

”ریاض بھائی آپ ان کا فائدہ مت سوچیں۔۔۔۔۔ ان کو من مانی کر لینے دیں۔۔۔۔۔ نقصان بھی تو انہیں کو ہونا ہے۔“

”آخر آپ بھی تو ایک عورت ہیں۔“

ریاض کی بات سے میمونہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور جواب دیتے ہوئے بولی۔
آپ بازار کا پروگرام بنا رہی ہیں اور وہاں پر گرما گرم پروگرام شاہ پہلوی کے محل کو دیکھنے کا بن رہا ہے۔
”میں تو صبح محلات کی سیر کروں گی۔“

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ناہید نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

بلیقیس جی تہران دیکھ لیا ہے۔ سمجھ لیں محل بھی دیکھ لیے ہیں صبح بازار چلتے ہیں۔

عورت ہونے کے ناطے چند لمحوں کے لیے میں ڈمگ گئی۔ میمونہ میری کیفیت بھانپ رہی تھی۔ ریاض بھی حیرانی سے میری جانب دیکھ رہے تھے کہ یہ بازار کی بجائے محل دیکھنے کی خواہش کر رہی ہے۔

”پھر کیا کیا فیصلہ۔“

ناہید کی بات سے میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

itsurdu.blogspot.com

”ناہید کی اس بات سے میں نے جواب دیا۔

جانتی ہوساتھ والی میز پر بیٹھے صاحب نے سلا کی پلیٹ اٹھانے کو کہا۔ تو ویراس کے سامنے رکھا ہوا کھانا بھی اٹھا کر لے گیا اور وہ بے چارہ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

ناہید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہاں ایسا نہیں کرے گا۔“

”کیوں نہیں کرے گا۔“

”کیونکہ میں نے غصے سے کھانا کھا تھا۔۔۔۔۔ تب کہیں لے کر آیا تھا اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے بھوک بہت لگی ہے۔“

”ضروری نہیں کہ وہی پیرا تمہارا کھانا اٹھائے۔۔۔۔۔ کوئی اور بھی آ کر لے جاسکتا ہے۔“

”چلیں دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور مہر لگی ہوئی ہے تو ضرور رکھالوں گی۔“

”ہم عورتوں نے اپنا الگ سے ٹولہ بنایا ہوا تھا۔۔۔۔۔ مگر مرد حضرات نے کھانا کھاتے وقت صبح کا پروگرام سیٹ کر لیا۔۔۔۔۔ طے یہ پایا تھا کہ سات اور آٹھ کے درمیان ناشتہ کرتے ہی ہم نوبچ کے قریب بسوں میں بیٹھ جائیں گے۔

”ٹھیک نو ہے۔“

ناہید بڑ بڑا کی۔

میں تو نہیں جا رہی۔۔۔۔۔ آپ لوگ سات بجے کی بجائے صبح چھ بجے ناشتہ کے لیے آ جائیں۔۔۔۔۔ ان کی رفتار بہت سست ہے۔ یہ نہ ہو کہ بغیر ناشتہ کے ہی جانا پڑے۔“

ناہید کی بات سن کر سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔۔۔۔۔۔ تنہی سی جان سب کو ہنستے دیکھ کر ماں کی گود میں مسکرا رہی تھی۔۔۔۔۔۔ جیسے سب باتوں کی اس کو سمجھ تھی۔

صبح ناشتہ کے لیے لابی میں پہنچے تو ڈرائنگ ہال میں سب کو ناشتہ کرتے ہوئے پایا۔۔۔۔۔ ناہید کی بات سچ ثابت ہوئی۔ پورے آٹھ بجے ناشتہ کے لیے آؤر دیا اور حسب معمول انتظار کرتے رہے۔ پورے نو بجے کے قریب ناشتہ ہماری میز پر چن دیا گیا۔ سب لوگ تو فارغ ہو چکے تھے مگر ہمارے ساتھ والی میزوں پر اکا دکا مسافر ناشتہ کرنے میں مشغول تھے۔

ناہید اور حسن آرا میرے قریب آتے ہوئے بولیں۔

”تم محل دیکھنے کی غرض سے جا رہی ہو۔“

”ہونہ۔“

میں نے بڑے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

”اچھا چلی جاؤ۔۔۔۔۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔“

”کرنا بھی نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ میں اتنی دور سے سیاحت کی غرض سے آئی ہوں میرا جانا ضروری ہے۔“

”اچھا بابا جاؤ۔“

وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔۔۔۔۔ سب لوگوں کو جانے کی اتنی جلدی تھی کہ ہم ٹھیک طرح سے ناتہ بھی نہ کر سکے اور باہر بس میں آ کر بیٹھ گئے۔

شاید ہمارا ہی انتظار مقصود تھا کہ بس چل پڑی۔ دن کے وقت تہران شہر کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا چوڑی اور کشادہ سڑک پر بس اپنی مخصوص رفتار پر چل رہی تھی۔ پام کے درخت سارے راستے ہمارے ہم سفر بنے بس کی رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔

ہوٹل سے لے کر شاہ پہلوی کے محل کا راستہ بہت ہی خوبصورت تھا نہ صرف پام کے درخت نظر آئے بلکہ جگہ جگہ گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جا بجا سبزہ اپنی بہار آپ دکھا رہا تھا۔ موسم بھی اس وقت دلفریب ہو گیا تھا نہ جانے اس وقت ہوا کہاں چھپی بیٹھی تھی۔ بس ایک مقام پر جا کر رک گئی۔

نیچے اتر کر پہاڑی کو نیچے سے دیکھا تو چوٹی پر محل مسکراتا ہوا ہم سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا تھا، چھپی ہوئی ہوائیں گلاب کے پھولوں کا منہ چومتی ہوئیں ہم تک پہنچ گئی تھیں۔۔۔۔۔ جگہ جگہ فارسی کے کتبے آویزاں تھے جن پر لکھا ہوا تھا عبرت گاہ ہے اور سوزیوں کا مسکن رہا ہے۔ یہ محل پہاڑ کے دامن میں چناروں، ایری کسیرہ، چیر اور پھل دار درختوں کے جھنڈ میں بنا ہوا تھا۔

ہم نے چڑھائی چڑھتے ہوئے دائیں طرف نگاہ دوڑائی تو چنار کے درخت اوپر سے ایسے ملے ہوئے تھے کہ دھوپ خال خال ہی ان میں داخل ہوتی تھی۔ درختوں سے لپٹی چوٹیاں سوڈیڑھ سوٹ سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ ہمارا سفر جاری تھا۔ محل دیکھنے کا تجسس بڑھ رہا تھا۔ دور سے محل نظر آنے لگا چاروں طرف سبزہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ محل کے لان اتنے سرسبز تھے یوں لگتا تھا کہ سبز رنگ کی ویلوٹ بچھی ہوئی ہے۔ ہر کوئی خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے چڑھائی چڑھتے ہوئے کہا کہ یہ محل صرف ایک

نہیں بلکہ اسی طرح کے اٹھارہ محل ہیں جن میں سے یہ ایک ہے۔ رضا شاہ پہلوی یہاں پر صرف تین ماہ قیام کرتا تھا باتیں کرتے کرتے ہم اوپر پہنچ گئے۔ محل کے گمرانوں نے جب ہمیں دیکھا تو سب سے پہلے ہمیں حکم دیا گیا کہ ”جو تیاں باہر ہی اتار کر اندر آئیں۔“ ہم نے ان کے کہنے پر جو تیاں باہر ہی اتار دیں اور محل کے اندر داخ ہو گئے۔ اندر جا کر لابی میں عقل دنگ رہ گئی۔ انتہائی خوبصورت نازک کام والا قالین بچھا ہوا تھا جس کو تیار کرنے میں پندرہ بیس سال ضرور لگے ہوں گے اور بے حد خوبصورت سونے چاندی کی گھڑیاں اور بت موجود تھے۔ سیزھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو شاہ کا ڈرائنگ روم دیکھا اس میں لابی سے بھی زیادہ قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ خوبصورت بیننگ دیواروں پر آویزاں تھیں۔ قالین کے ہم رنگ پردے اور فرج اور شاہ پہلو کے سٹچوز بھی ایک کونے پر سجے ہوئے تھے۔ عمدہ قسم کے کرشل زیبائش کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ہمارا گائیڈ ساتھ ساتھ قالینوں کی لمبائی اور چوڑائی بھی بتا رہا تھا اس کے کہنے کے مطابق 73 یا 75 میٹر سے کم کوئی قالین نہیں تھا۔ چھتوں پر قیمتی فانوس اور بعض چھتوں پر سونے کا کام بنا ہوا تھا ویسے رضا شاہ پہلو کا محل دیکھنے میں کوئی اتنا نادر نہیں لگتا تھا اب تو پاکستان کے کئی گھر اسی طرح کے سجے ہوئے ملتے ہیں۔ بات حیرت کی یہ تھی جو سونے کا بیش بہا استعمال تھا ڈرائنگ روم کے باہر شوکیسوں میں سونے چاندی کے ظروف اور چھتوں پر قیمتی فانوس لگے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کے باہر شوکیس میں سونے سے تیار کردہ چیزیں بہتات میں موجود تھیں۔

ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے اور باہر کھڑے ہو کر اس کو غور سے دیکھا تو آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ اس میں قیمتی کرشل اور منقش کراکری موجود تھی۔ سائیڈ بورڈ کا کام لکڑی اور سونے سے بنا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف کھینچ رہی تھی وہ شاہ کا ڈائنگ ٹیبل تھا جس پر کرشل کے برتن بمہ چھری کانٹوں سے لگے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ رضا شاہ پہلوی کہیں باہر گیا ہوا ہے ابھی لوٹے گا اور میز پر کھانا لگا دیا جائے گا اور وہ کھانے میں مصروف ہو جائے گا۔ پھر انسان کی بے ثباتی یاد آ گئی۔ اس محل کو دیکھ کر بار بار خیال پیدا ہو رہا تھا کہ ہر چیز نے فنا ہو جانا ہے۔ اس حکمران کے بارے میں احساس ہو رہا تھا اتنے عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے بعد آخرا انجام کیا ہوا۔ اپنے ملک میں کفن پہننا بھی نصیب نہ ہوا۔ واقعی ہی اس محل کے باہر کتبہ آویزاں تھا۔ محل دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ واقعی ہی یہ محل عبرت گاہ ہے۔ انسان خدا کے آگے بے بس اور حقیر شے ہے۔ جب چاہے خدا کا قہر اس پر نازل ہو سکتا ہے۔

کھانے کا کمرہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ شاہ کا دفتر دیکھنے چلے گئے۔ یہاں پر بھی جو قالین بچھا ہوا تھا وہ بھی نیلے رنگ کا پھول بوٹوں سے مزین تھا۔ اس قالین کا کام بھی نہایت ہی باریک اور نفیس تھا۔ بہت ہی قیمتی فرنیچر اور سونے کی چیزیں یہاں پر بھی موجود تھیں اور

گمان ہوتا تھا کہ شاہ ابھی کہیں باہر سے آجائے گا اور دفتر میں بیٹھ کر اپنا کام شروع کر دے گا۔

دفتر میں کھڑے ہو کر دور نگاہ پڑی تو فرح اور شاہ پہلوی کے سنہری سٹیچوز یہاں سے بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان سٹیچوز کو دیکھ کر سوچا۔ ”یہ لوگ اب کہاں ہیں۔ واقعی سب کچھ یہیں رہ جانا ہے اس محل کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے میں اداس ہو گئی تھی۔ یہ سونے چاندی کے ظروف، قیمتی فرنیچر، کرٹل اور فانوس۔۔۔۔۔۔ دنیا کی قیمتی سے قیمتی اشیاء تو ایک طرف ایک تنکے تک اپنے ساتھ نہیں لے جاسکے تھے۔ پھر انسان کسی چیز پر اترا تا ہے دیکھا جائے تو وہ بڑی ہی چھوٹی شے ہے۔

”چلو بلیقیں فرح کا بیڈروم بھی دیکھیں“ ریاض کی آواز سے میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا اور میں جیسے سوتے سے جاگ گئی۔ ملکہ فرح دیبا کی خواب گاہ کے قریب میرے قدم جم سے گئے۔ وہاں پر ہر چیز بڑے ہی قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ اتنی خوب صورت مسہری سجی تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی خواب سے بیدار ہو کر کہیں گئی ہے اور ملازمین نے کمرہ صاف ستھرا کر دیا ہے۔ یہ خواب گاہ بھی بہت بڑی تھی۔ جس میں مسہری کے ہمرنگ پردے آویزاں تھے۔ ایک بات قابل غور تھی کہ ہر بیڈروم میں نیلا کارپٹ اور پردے لٹکے ہوئے تھے۔ شاید شاہ پہلوی کو نیلا رنگ بہت خوبصورت لگتا تھا۔ بیڈروم کے سامنے کھڑے تھے پھر چانک ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فرح ابھی کہیں سے آجائے گی اور بستر پر لیٹ کر تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے لگے گی۔

خواب گاہ دیکھنے کے بعد کئی اور بھی بیڈروم دیکھے ایک سے ایک بڑھ کر قیمتی، قدیم نوادرات کی بھرمار تھی جن کو دیکھنے کے لیے ایک مہینہ چاہیے۔

محلوں میں سے ایک اور محل میں ہمیں لے گئے جو سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ جس کے فرش مختلف رنگوں کے سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ بتایا گیا کہ اس محل میں ملکہ کی ماں رہتی ہے۔ وہاں پر کھڑے ہو کر سامنے جو دیکھا تو برف کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔۔ منظر اس قدر دل فریب تھا کہ جی چاہتا تھا وہیں بیٹھے رہیں۔ یہاں پر بڑا ہی خوبصورت چپس روم تھا۔ اس کے قریب ہی فرش پر ایک غریب عورت کی تصویر پڑی تھی جو بے سرو سامان بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں اداسی چھلک رہی تھی سوکھا روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ یعنی غریب لوگ سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے تھے۔ ادھر یہ لوگ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہے فرح تو ایک طرف حیرانگی کی بات ہے کہ اس کی ماں کا بیڈروم دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ کہاں لوگ روٹی کے لیے سرگرداں تھے اور کہاں یہ لوگ قیمتی فرنیچر اعلیٰ سونے چاندی کے ظروف اور خوب صورت محلوں میں رہتے رہے اور وہ لوگ فاقے کاٹتے رہے شاید انہی کی وجہ سے یہ زوال آیا تھا۔ خیر بات ہو رہی تھی فرح کی ماں کے محل کی۔۔۔۔۔۔ بیڈروم میں اعلیٰ مسہری اور قیمتی فرنیچر کے علاوہ الماری کا پٹ

کھلتا تھا خوب صورت دیدہ زیب لباس نظر آ رہے تھے اور اسی کے ہم رنگ قیمتی جوتے جو کہ اوپر کے خانے میں سجے ہوئے تھے۔ اگر یہ لباس اور جوتیاں ماں کی تھیں تو بیٹی کیا کچھ نہ پہنتی ہوگی۔ سارا فرنیچر اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ یہاں پر بھی شوکیسوں میں سونے چاندی کے ظروف اور دیگر اشیا موجود تھیں۔ اسی طرح فانوس، قیمتی قالین اور نہ جانے کیا کچھ تھا یہاں جو بیان نہیں کیا جا سکتا سبز دھیاں اتر کر نیچے لابی میں آئے تو بڑی بڑی پیئنگنگ کے علاوہ شوکیسوں میں ہندوؤں کے بت جو صندل کی لکڑی سے بنے ہوئے تھے۔ نظر آئے ”شیواجی کے بت“ جس پر لکھا تھا ”Sandal wood and Ivory India“ شیشوں سے باہر کا منظر بہت بھلا لگ رہا تھا۔-----چاروں طرف سبز پھیلا ہوا تھا اور گھنے درخت سر جوڑے ہوا کے ہلکوروں سے جھوم رہے تھے۔

ہمارے وفد کے بھی لوگ ذوق و شوق سے محلات کی سیر کر رہے تھے بعض لوگوں کی رائے تھی۔ ”جیسا سنا تھا کہ رضا شاہ پہلوی کا محل بہت خوبصورت ہے ویرادیکھنے میں نہیں ہے۔ اب تو پاکستان میں اس محل کے نقشے کے گھر نظر آتے ہیں۔“ وہ صاحب ٹھیک فرما رہے تھے مگر مجھے دوبارہ کہنا پڑے گا کہ قیمتی فرنیچر، سٹیچوز اور کرشل کا سامان ضرور ملے گا۔ مگر سونے کا استعمال ابھی تک ہمارے ملک کے گھروں میں نظر نہیں آئے گا جو کہ اس محل میں موجود ہے۔

ہم لوگ محل سے واپس بس کی جانب آئے ہی تھے۔۔۔۔۔ کہ باداموں کے پیکٹ اور کوکا کولا سے ہماری تواضع کی گئی۔ سب لوگوں کی مختلف رائے تھی۔ کئی لوگوں کو محل بہت پسند آئے اور بعض لوگ اپنے پاکستان کے گھروں کو ترجیح دے رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی ملک غریب سہی مگر رہنے والے امیر ترین لوگ ہیں۔ شاید ایسے گھرانے کے پاس ہوں۔

محل دیکھنے کے بعد جب ہوٹل پہنچے تو سب کی خواہش تھی کہ تھوڑی سی شاپنگ کی جائے۔۔۔۔۔۔ کئی لوگ تو شاپنگ کی خاطر محل بھی نہ دیکھنے گئے تھے۔ لوگوں کے بھرپور اصرار سے صبیحہ بیگم جو کہ پی آئی اے منجر کی اہلیہ تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کو خواتین کی خواہشات کے بارے میں بتایا کہ وہ شاپنگ کے لیے بھند ہیں۔ انہوں نے مجبوراً وفد کے لوگوں کے لیے بازار جانے کا بندوبست کر دیا۔

چار بجے کے قریب ہم سب دو بسوں میں بازار کی سمت جا رہے تھے۔ میمونہ کی کھٹی میٹھی باتیں، نصرت کی شرارتی آنکھیں اور حسن آرا کی معصومیت لیے ہم بازار گئے اور ایک وینڈی کرافٹ کی دکان پر بیس رک گئیں۔ شاپنگ کے لیے صرف ڈیڑھ دو گھنٹے دیئے گئے تھے۔ وقت کم اور مقابلہ سخت سمجھ لیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے شہد کی مکھیاں کسی چھتے سے نکل کر دوکاندار پر چھٹ پڑی ہوں۔

itsurdu.blogspot.com

گئے۔“ میں نے حیرانگی سے سوچتے ہوئے میاں سے پوچھا ”اگر لینا نہیں تو مت لو ہم کچھ اور دیکھ لیتے ہیں۔ وہ ساتھ والی دوکان میں گھس گئے۔ سارا وقت مجھے شاپنگ پر باز کرتے رہے اور اچانک کیا خیال آیا کہ دوسری دوکان میں گھس گئے تھے شاید جوتوں کی دوکان تھی۔ میری ہنسی چھوٹ گئی، یہ شخص بھی عادت سے مجبور ہے ونڈو شاپنگ کرنا اس کی عادت ہے۔

بس نے جب زوردار ہارن دیئے تو لوگوں نے دوکانوں سے نکل نکل کر بس میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ سب لوگ بیٹھ چکے تھے اور میرے شوہر نہ جانے کہاں چھپے بیٹھے تھے بس نے جب کافی مرتبہ ہارن دیا تو مجھے بس سے اترنا پڑا۔۔۔۔۔ میں نے جوتوں کی دوکان میں سے ان کو برآمد کر لیا۔

”کمال ہے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔“
وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بس تک آئے اور خاموشی سے بیٹھ گئے بس چل پڑی تو ناہید نے مجھے اکسایا۔

”تم نے لیپ نہیں خریدے۔۔۔۔۔ خدا کے لیے خرید لو بہت خوبصورت ہیں۔“
”تم نے کب خریدے۔“

”بھئی صبح جب تم محل دیکھنے گئی تھی تو میں نے لیپ اور لائیٹ خریدی ہے۔ بہت ہی سستی اور خوبصورت ہے۔“

کافی لوگوں کی نیت واپس ہوٹل جانے کی نہیں تھی وہ مزید ارشاپنگ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے ریاض سے کہا۔
”چلو ہم بھی راستے میں اتر جاتے ہیں۔“
”اور واپس کیسے آئیں گے۔“

”انہیں لوگوں کی طرح ٹیکسی پر آ جائیں گے۔ تہران شہر کے بازار تو دیکھے ہی نہیں۔“

میری بات سے میرے میاں لا جواب ہو گئے۔ راستے میں بس رکی تو کچھ لوگ اتر گئے، میں نے بھی اپنا سامان فرخندہ اور ناہید کے حوالے کیا اور راستے میں ہی اتر گئی۔

ریاض خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف شیشے کے سامان اور کرشل اور برقی لیپوں کی دوکانیں تھیں ایک دوکان میں داغ ہوئے تو وہاں پر اٹلی اور سپین کی بنی چیزیں تھیں جو کہ بے حد مہنگی تھیں۔ ایران کی چیزیں ان کے آگے کچھ نہیں تھیں۔ دوکانوں میں رش بالکل نہیں تھا۔ دوکاندار صبر و تحمل سے بیت چیت کرتے جیسے گاہک کے مرہون منت پر تھے۔۔۔۔۔ چاہے تو خرید لے ورنہ انہوں نے خریدنے پر مجبور نہیں کرنا۔

اس دوکان کے بالکل سڑک پار مخالف سمت پر اسی قسم کی دوکان تھی۔

دوکان میں داخل ہوئے تو خوشبوؤں میں بسی خوب صورت موتی سازی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کا خاوند کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ وہ اٹلی کی بنی ہوئی چیزیں دکھا رہی تھی۔ اتنی بااخلاق خاتون میں نے سارے تہران میں نہ دیکھی تھی۔ ایک سجاوٹ کی چیز پسند آ چکی تھی۔ مگر وہ قیمت بہت زیادہ بتا رہی تھی۔ میرے میاں نے اس کے ساتھ فارسی میں بات چیت کی تو وہ کم قیمت پر دینے کو تیار ہو گئی اور کہنے لگی۔ ”ایک درخواست کرتی ہوں اگر آپ پوری کر دیں۔“

”کیا۔“

میاں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”میں بہت موٹی ہو گئی ہوں، میرا دل سمارٹ بننے کو کرتا ہے۔ آپ پاکستان سے پتلا کرنے کی گولیاں بھجوا دیں۔“

”پتلا کرنے کی“ ریاض نے حیرت سے پوچھا۔

”جی۔۔۔۔۔ میری سہیلی نے وہی گولیاں کھائی ہیں اور اس نے تیس یا نوٹڈ وزن کم کیا ہے۔“

”میں حیران ہوتے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ پاکستان میں رہتے ہوئے میری نظر سے وہ گولیاں کبھی گزری ہی نہیں تھیں۔ مگر ایران میں دہلا کرنے کی گولیوں کی مشہوری پہلی ہوئی تھی۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ چائے اور بسکٹ ہمارے سامنے رکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ ”مجھے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور جی تو کرتا ہے بقایا اسلامی ممالک دیکھے جائیں۔“

”پاکستان ضرور آئیں۔“

”میں اگر آئی تو آپ کے گھر ہی ٹھہروں گی“ وہ اتنی جلدی مجھ سے گھل مل گئی۔ میں حیرانگی سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں اور میرے منہ سے نکل گیا۔

”بڑے شوق سے آئیں۔“

آپ پاکستانی واقعی بہت اچھے ہوتے ہیں! پتہ نہیں قسمت میں پاکستان دیکھنا ہے کہ نہیں۔ مگر آپ کی دعوت سے میں محفوظ ہوئی ہوں۔ اس خاتون سے ہم نے درخواست کی کہ ہمیں ٹیکسی منگوا دیں۔ یہ سنتے ہی اس کے شوہر نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

”ہم اپنی گاڑی سے آپ کو ہوٹل تک چھوڑنے جائیں گے۔ آج آپ ہمارے مہمان ہیں۔“ چھوٹا سا کارٹن جو ہم نے خریدا تھا۔ جلدی سے گاڑی میں رکھا اور اس خاتون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم اس کے شوہر کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہما ہوٹل دوکان سے

زیادہ دور نہ تھا۔ چند منٹوں میں ہی اس نے ہمیں پہنچا دیا، بلکہ اندر جا کر ویٹر کو بلا کر سامان بھی گاڑی سے نکلوا دیا۔ میں حیرانگی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ قوم کتنی بااخلاق ہے۔

ہمارا ہوٹل کی بالائی منزل پر ایرانی ایئر لائن نے ہمارے اعزاز میں عشاء دیا ہوا تھا ہوٹل کی چھت پر یہ بندوبست کیا گیا تھا۔ ناہید اپنے کمرے میں پیکنگ کرنے میں مصروف تھی اور ہم لوگ تھکے ٹوٹے بازار سے واپس آئے ہی تھے کہ کھانے کے لیے ہمیں بلایا گیا تھا۔

کھانے سے پہلے تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا اور ایرانی ایئر لائن کے میجنگ ڈائریکٹر نے بڑی شستہ فارسی میں تقریر کی جس کا ساتھ ساتھ ترجمہ ایک مترجم انگریزی میں کر رہا تھا۔ اس کے بعد جوابی تقریر ہمارے پی آئی اے کے ڈائریکٹر مستجاب حیدر نے کی۔ اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہو گیا۔

کھانا پیش کیا جا رہا تھا کہ ایک خاتون اچھی شکل و صورت کی ہی نہیں تھی بلکہ کافی سمارٹ کہہ سکتے ہیں، میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس کو پاکستانی بہت اچھے لگتے تھے کیونکہ اس خاتون کا شوہر بھی پاکستانی تھا۔ ہماری گفتگو انگریزی زبان میں ہو رہی تھی اس نے بتایا کہ میں ایرانی ایئر لائن کے سٹیشن منیجر کی اہلیہ ہوں۔ میں نے اس کی جانب غور سے دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔

لباس خالصتاً ایرانی طرز کا پہنا ہوا تھا۔

”مجھے تو پاکستانی لباس بہت پسند ہیں۔“

”تو پہنا کریں نا۔“

میرے شوہر جب بھی پاکستان جاتے ہیں میرے لیے پاکستانی لباس لے کر آتے ہیں۔ جن کو میں اپنے گھر میں ہی پہنتی ہوں۔ اس کے برابر میں ایک اور ایرانی خاتون میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”خوبصورت لباس گھر ہی پہنا جاتا ہے۔ باہر عمدہ لباس نہیں پہن سکتے اور پھر اس برقعہ نما جبہ میں لباس کیا نظر آئے گا۔ جی تو کرتا ہے چوڑیاں پہنوں، ڈھیر ساری جیولری مختلف رنگوں کی، نئے نئے سوئٹوں کے ساتھ پہنوں۔“

”آپ کا شوق بجا ہے۔ عورت کا دوسرا نام ہارسنگار بھی ہے۔ ٹھیک ہے کہ عورتیں موڈرن ہو گئی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کچھ پہنیں ہی نا۔“

”امی تو ایک طرف میری نانی اتنی فیشن ایبل تھیں وہ اپنے لباس ایران سے نہیں سلواتی تھیں بلکہ وہ پیرس کے سٹریٹ کے پہننے والی تھیں۔ نانی کی سہیلیاں بھی بہت آزاد خیال تھیں۔ مگر نہ جانے ہمارے زمانے میں اتنی پابندی کیوں لگ گئی ہے ہم کچھ پہن اوڑھ نہیں سکتے۔ لیکن میں نے سوچ لیا ہے کہ پاکستان جا کر نئے فیشن کے خوب لباس بنواؤں گی اور پہنوں گی۔“

وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ حسن آرا، فرخندہ، میمونہ، نصرت سب اس کی باتوں کو غور سے سن رہی تھیں۔ ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہاں پر عورتوں ہی کی حکومت تھی۔ میں نے اس کی باتوں کا جواب دینا چاہا تو میری نظر سامنے چاروں طرف سے لگے شیشوں پر پڑ گئی۔ پورے شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس وقت کا منظر بے حد دلفریب لگ رہا تھا۔ بالکل وہ شہر پیرس ہی کی طرح لگ رہا تھا۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہے۔ اب میں کیا جواب دیتی خاموشی سے ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ ایرانی ایئر لائن کے سٹیشن منیجر کی اہلیہ مطمئن سی بیٹھی تھیں۔ ان کے لبوں پر کوئی شکوہ نہیں تھا۔

بہت ہی عمدہ سوپ پیش کیا گیا۔ میزوں پر پھول سجے ہوئے تھے ایرانی اور پاکستانی خوش گپیوں میں مشغول تھے اور ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔ بہت سی چیزوں کے ساتھ انہوں نے چلوں کباب بھی رکھ دیئے۔

”یہ چلوں کباب شاید آپ لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔“

ایرانی خاتون نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

سادے چاولوں کے ساتھ ہمیں بے حد پسند ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا ”کہ ہمارے گھر چلوں کباب نہ بنیں۔“

”تمہارے میاں بھی یہی کھانا کھاتے ہیں۔“

”وہ پاکستانی کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔ اب تو پاکستانی کھانا مجھے بھی پسند آنے لگا ہے۔“

خواتین کی دو تین ٹولیاں بنی ہوئی تھیں۔ صبیحہ بیگم اور مسز ممتاز بھی ان سب میں باتوں میں مشغول تھیں۔ ناہید بڑی ہی نازک اندام تھی۔ پیکنگ کرنے کے بعد وہ اپنے بستر پر دراز ہو گئی تھی۔ بے چاری شاید تھک گئی تھی۔ مگر کرنسی ابھی تک اس کے پرس میں پچی پڑی تھی صبح کے وقت ہماری روائی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح سے ان روپوں کو بھی خرچ کیا جائے۔ وہ ہوٹل کی دوکان پر جا کر کچھ کام کئے لکڑی کے فریم بھی خرید چکی تھی۔ فریم خریدنے کے بعد کرنسی پھر بھی بچ گئی تھی۔ تو وہ پریشان سی نظر آنے لگی۔

عشایے کے دوران تصاویر کھینچی جا رہی تھیں۔ ہر کوئی ان لوگوں کا شکر یہ ادا کر رہا تھا۔ کل ہماری روائی تھی یوں لگتا تھا یہاں آئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔

سونے کے لیے جب میں اپنے کمرے میں آئی تو مجھے خیال ہوا کہ میرا کارٹن تو کھلا پڑا ہے۔ کیوں نہ کوئی رسی منگوا لی جائے اور ابھی سے باندھا جائے یہ سوچتے ہوئے میں نے ریسپشن پر فون کیا اور رسی کا مطالبہ کیا۔ وہ ٹھہرے ایرانی زبان ان کی فارسی خیر انگریزی کا سہارا لے کر ان سے بات چیت کی۔ میں انتظار ہی کرتی رہی مگر کوئی بھی رسی دینے نہ آیا۔ دوبارہ فون کیا اور اصرار کرتے ہوئے درخواست کی کہ صبح نو بجے ہم نے ایئر پورٹ چلے جانا ہے۔ خدا کے لیے کوئی رسی بھیج دیں۔ مگر سٹائی نہ ہوئی پھر فون کیا تو بیرے نے دستک دی میں نے اسے اندر آنے کے لیے کہا تو وہ آدھا گز کا کلکڑا ناکلین کی رسی کا لے آیا۔

”یہ اتنی تھوڑی ہے۔“ میں نے حیرت میں پڑتے ہوئے کہا۔

”بس میڈم یہی ہے۔“

اتنا بڑا ہوٹل اور آدھے گز کا کلکڑا میرا منہ پڑا رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نیچے ریسپشن تک گئی اور اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے میری بات غور سے سنی اور کہا۔ آپ اوپر جائیں ہم سنور میں سے رسی ڈھونڈتے ہیں۔ میں اوپر آ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اگر رسی نہ ملی تو سامان کھلا ہی رہ جائے گا۔ سامنے بستر پر نظر پڑی تو میاں صاحب آرام سے خواب استراحت کے مزے لے رہے تھے۔

”اتنی چین کی نیند سو رہے ہیں کمال ہے ذرا بھر فکر نہیں کہ صبح ہم نے چلے جانا ہے۔“

”بھئی انھیں۔“

”میں نے ان کو جھنجھوڑا۔“

”کیا بات ہے۔“ وہ نیند میں ہی بولے۔

”رسی نہیں مل رہی۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“

سامان کھلا ہی رہ جائے گا۔ خدا کے لیے نیچے جائیں اور کوئی بندوبست کریں۔“

”اچھا ہے سامان کھلا ہی رہے تو۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“

”ویسے بھی لے جانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہاں ہوٹل ہی کسی کو دے دیں گے۔“

واہ اتنی مشکلوں سے صراحیاں لی ہیں۔۔۔۔۔۔ ایران کی خاص سوغات ہے۔“

”بھئی مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ اگر بندوبست ہو گیا تو ٹھیک ہے نہ ہو سکا تو اس بے چارے ویٹر کو دے جائیں گے۔ اس نے میری خدمت بھی خوب کی ہے۔ جو کام بتلایا بھاگ بھاگ کر کیا۔ اس کو میں ٹپ دے چکی ہوں پھر غصے سے کہا۔ کیا ویٹر کو دینے کے لیے خریدی تھیں؟“

”مجھے تنگ نہ کرو۔۔۔۔۔۔ شاباش سو جاؤ۔“ ریاض چند لمحوں میں ہی سو گئے جو ادھورا خواب چھوڑا تھا اس کی کپڑی کے ساتھ کڑی ملا تے ہوئے نیند میں پھر خواب دیکھنے لگے۔

میں نے سونے کی ناکام کوشش کی۔۔۔۔۔ سامنے کھلا کارٹن میرا مجھے بے آرام کر رہا تھا۔ اب کیا کروں میں نے بے بسی سے سوچا اور اپنے میاں پر غصہ بھی آیا جو مزے سے خراٹے لینے لگے تھے۔

”خدا با۔“

میں پریشان ہو چکی تھی۔ پھر مجھے ایک دم ان ایرانی لوگوں پر غصہ آیا کہ کوئی بھی پاکستانی یا انگریزی زبان تھیک سے سن نہیں پاتا۔ میں نے ریسپشن پر فون کر کے کہہ دیا کہ مجھے چھ بجے جگا یا جائے۔۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے مطمئن ہو گئی تھی اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ دیر تک جاگتی رہی نہ جانے کس پہر آنکھ کھل گئی تو دیکھا چھ بجے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ہم جاگ گئے ہیں۔

ایک بار پھر ہمت کر کے شوہر کو جھنجھوڑا۔ ”خدا کے لیے اٹھو اور رسی کا بندوبست کرو۔۔۔۔۔ چیزیں کھلی پڑی ہیں۔“ کمال ہے رات کو بھی سونے نہیں دیا اور اب صبح ہی صبح اٹھا دیا ہے۔ رسی پانچ منٹ میں مل جائے گی۔ دو منٹ میں پیکنگ ہو جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں مجھے آٹھ بجے جگا دینا اور وہ پھر سو گئے۔

میں نے نہا کر لباس بدلا اور تیار ہو کر نیچے آ گئی۔

ابھی لفٹ سے اتری ہی تھی کہ ایک منتظم خاتون پر میری نظر پڑی میں نے اس کو بلایا اور انگریزی میں بات کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے ویٹر کو سی لانے کو کہی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے میری پریشانی دیکھ کر مسکرائی اور مجھے مطمئن کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ پریشان نہ ہوں میں انگریزی زبان اچھی طرح سمجھ لیتی ہوں کیونکہ میرا امریکہ سے تعلق ہے۔ بس نوکری کے سلسلے میں یہاں آنا پڑا۔“

”تو کیا آپ امریکن ہیں۔“

”جی۔۔۔۔۔ مگر شوہرا ایرانی ہے۔ پہلے وہ اس ہوٹل میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد میں نے یہ کام سنبھال لیا ہے۔ میرے دو بیٹے ابھی تک امریکہ میں زیر تعلیم ہیں۔ اس خاتون نے بھی جب پہنا اور سر پر سکارف کس کر باندھا ہوا تھا۔ ایک بال بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ابھی چند منٹ ہی وہاں کھڑی ہوئی تھی کہ اس نے سیٹر کو آتے دیکھ کر کہا۔ ”صرف رسی ہی نہیں چاہیے بلکہ پیکنگ بھی کرو۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ویتر کے ساتھ اوپر آ گئی۔ میاں صاحب حسب معمول سو رہے تھے۔ میں نے چپ چاپ اس ویٹر سے پیکنگ کروالی۔ بیرے کے جاتے ہی میں نے ایک بار پھر جھنجھوڑا۔ ”اب تو اٹھ جاؤ، اٹھ بج گئے ہیں۔“ ریاض آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ گئے سامنے کا دروازہ ہلا پڑا تھا۔

”اچھا تو یہ پیک ہو چکا ہے۔“ میں تو پہلے ہی کہتا تھا تم تو ہر بات میں فکر مند ہو جاتی ہو۔ چند منٹوں کا کام تھا۔ معمولی معمولی باتوں کو بھی سر پر چڑھا لیتی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بے نیازی سے غسل خانے میں چلے گئے اور میں حیران ہی ان کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی ”اگر ان پر رہتی تو ہو چکی تھی پیکنگ۔“

روانگی کے لیے بسوں نے ہمیں تہران کے ہوائی اڈے پر اتار دیا۔ ایئر پورٹ کے باہر ایک بوڑھا شخص ہمارا منتظر تھا۔ بس کے رکتے ہی اس نے مرد حضرات سے ہاتھ ملایا اور خواتین کو سلام کیا۔ ہم سب حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون ہے۔ اس نے میرے میاں کو بتایا کہ ”میں پاکستانی ہوں اور گذشتہ کئی سالوں سے مشہد میں قیام پذیر ہوں۔ پاکستان کی محبت میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پھر دے دے الفاظ میں حکومت پاکستان کا گلہ کیا۔

اس نے میرے شوہر کو یہ بھی بتایا کہ اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حکومت پاکستان مشہد میں ایک قیمتی اراضی کے ٹکڑے کی مالک ہے اور یہ بھی بتایا کہ کئی سالوں سے وہ کوشش کر رہا ہے کہ مشہد میں پاکستانی زائرین کے لیے مسافر خانہ، شفا خانہ اور بہت ساری سہولتیں ان کو میسر کی جائیں۔ مگر کئی سولوں کی کوشش بار آور ثابت نہیں ہوئی۔ مرحوم ضیاء الحق کو خط بھی لکھے وزارت خارجہ کو بھی آگاہ کیا محتسب اعلیٰ کو بھی کئی درخواستیں دیں لیکن کوئی شنوائی نہیں ہو سکی۔ اس نے تمام پاکستانیوں کو کہا کہ اس کی مدد کی جائے۔ تاہم بس سے اترنے والے تمام پاکستانیوں نے وعدہ کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ کریں گے۔

اس بوڑھے سے بات چیت کرنے کے بعد اب ہم جہاز میں سفر کرنے کی سوچنے لگے۔ جہاز تک پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا پہلے بھی

میں حیرانگی سے ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ گو میرے پاسپورٹ پر چھوٹی بچی کا اندراج موجود تھا مگر ہم تو اس کو ساتھ ہی نہیں لے کر آئے تھے لیکن وہ بضد تھے کہ بچی کو پیش کرو۔ ہم نے ہر چند سر پٹکا کہ ”بھی ہم صرف دو میاں بیوی آئے ہیں اور بچی پاکستان میں ہے۔ مگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی۔۔۔۔۔۔ اسی دوران انور خان آگئے اور انہوں نے انہیں سمجھایا کہ بچی واقعی ہی پاکستان میں ہے۔ انور خان کے سمجھانے پر انہوں نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ ہمیں روک ہی لیا جاتا۔ پھر ایران سے نکلنے کے لیے بچی کو پاکستان سے منگوانا پڑتا۔

ہم تو خیر خیریت سے اس کٹھن مرحلے سے نکل آئے تھے۔ مگر ہمارے چند مسافر ابھی تک زیر عتاب تھے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے کتابوں کی دکان جو کے راستے میں ہی پڑتی تھی میرے میاں کتابیں دیکھنے لگے حافظ کا دیوان، عمر خیام کی رباعیات اور قرآن کے نسخے جو شاید پاکستان میں موجود نہیں تھے وہ خرید لیے اور جہاز پر سوار ہونے لگے۔ خدا خدا کر کے پہلا قدم جہاز میں رکھا تو جان میں جان آئی، یوں لگا جیسے کہ اپنے پیارے وطن میں آگئے ہیں۔